اردو داستان میں ہند اسلامی تہذیب

محمد مزمل

ریسرچ سکالر پی-ایچ-ڈی (اردو)

ادارہ اردو زبان و ادبیات، پنجاب یونی ورسٹی لاہور

ڈاکٹر زاہد منیر

پروفیسر

ادارہ اردو زبان و ادبیات، پنجاب یونی ورسٹی لاہور

Abstract

Hind-Islamic civilization, for the last one thousand years, has remained the determining factor in shaping the history, culture, social norms and thought patterns, likes and dislikes and personalities of the people of Indian Sub-Continent. It has also reshaped the content and form of different fine arts like poetry, music, architecture, calligraphy and has infused the spirit of Islam in all genres of Indian literature. Dastan, like Ghazal, is a substantial archive of the vast cultural, ethnic and religious diversity of this home of many nations. This article specifically studies the portrayals of culture and everyday life of the Sub-Continental man in Urdu Dastan. The aim of this article is the make available for the reader the heart and mind of the people of this region which were once imbued with the shared feelings, aspirations, cultural norms nestled and nurtured by a millennia-old social bonding of Hindus and Muslims.

Keywords: Hind-Islamic Civilization in Urdu Dastan

قصہ کہانی اور انسانی زندگی کا تعلق ہزاروں سال پرانا ہے۔ انسانی حیات کے آغاز میں انسانی جنگلوں اور غاروں میں رہتا تھا۔ شکار اس کا ذریعہ حیات تھا۔ وہ مختلف قدرتی آفات اور جنگلی حیات سے برسرپیکار رہا۔ اس کے لیے یہ بات بڑی حیران کن تھی کہ اس کے خاندان کے کسی فرد کو سوتے ہوئے کسی زہریلے کیڑے نے کاٹ لیا اور وہ صبح مردہ حالت میں تھا یا کوئی جنگلی درندہ کسی فرد کو اٹھا کر لے گیا۔ ان سب چیزوں نے اس کے ذہن میں مافوق الفطرت عناصر کو جنم دیا۔ وہ اپنے ڈر، خوف اور بہادری کے واقعات میں دوسروں کو شریک کرنا چاہتا تھا۔ اور یہ آپ بیتی قصہ گوئی کا سبب بنی۔ جنگل کی زندگی کٹھن اور دشوار تھی۔ سارے دن کی تھکن دور کرنے کے لیے کسی دل فریب مشغلے کی ضرورت تھی۔ تاکہ زندگی کی تلخیوں اور سختیوں کو وقتی طور پر فراموش کیا جاسکے۔ اور اپنے تجربات خاندان اور دوسرے لوگوں میں منتقل کیے جاسکیں۔ یہ کہانی کی ابتدا ہے۔ انسانی زندگی نے ارتقائی مراحل طے کیے۔ انسان جنگلوں، پہاڑوں اور غارون سے نکل کر میدانوں کی طرف آیا۔ اس کا واسطہ لہلہاتے ہوئے کھیتوں سے پڑا۔ رہنے کے لیے چھونپڑیاں تعمیر ہونے لگیں اور کہانی کا انداز بدلنے لگا۔ اب وہ اپنے جذبات واحساسات کو ضبط تحریر میں لایا۔ تصور اور تخیل کے آمیزش اس پر سرشاری کی کیفیت طاری کر دیتی اور آہستہ آہستہ اس فن کو عروج حاصل ہونے لگا۔ وقار عظیم لکھتے ہیں:

> ”کہانی انسان کے ان کارناموں کی روداد ہے جس میں اس نے اپنے ماحول کی کسی متصادم قوت کے مقابل آکر فتح حاصل کی ہو۔ کہانی انسان کے احساسِ برتری کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ کہانی حقائق کی دنیا سے دور تخیل، تصور اور رومان کے ایک جہانِ تازہ کی تصویر ہے۔ کہانی کا یہی تصور ہماری داستانوں کا بنیادی تصور ہے۔“[1]

قصے کہانیوں اسے انسان کی فطری دل چسپی کی وجہ سے دنیا کے بیشتر زبان و ادب میں ان کی روایات موجود ہے۔ اردو ادب میں بھی یہ فن داستان گوئی کی شکل میں موجود تھا۔ بلکہ داستان گوئی شاعری اور موسیقی سے قدیم تر ہے۔ ابتدائی دور کا انسان شعور کی ناپختگی یا انسانی وصف محبت کی وجہ سے جانوروں سے خاص شغف رکھتا تھا۔ اسے جانوروں میں انسانی خصوصیات نظر آتیں۔ خاص طور پر مشرقی روایات میں درختوں کا بہت احترام کیا جاتا ہے۔ قدیم دور کے انسان نے پرندوں اور جانوروں کو خاندان میں شامل کر لیا۔ اس لیے اس دور کے ادب میں وہ انسانوں کی طرح باتیں کرتے ہیں، مشورے دیتے ہیں۔ یہ انسان کی فطرت سے قربت تھی اور انسانی رشتوں میں وسعت کا اظہار۔ موضوع کے اعتبار سے داستانوں کو مہم جوئی، عشق و محبت، مافوق الفطرت عناصر اور جانوروں کے ذریعے اخلاقی سبق دینا میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ قدیم دور میں بھی انسان خاندان کی شکل میں رہا ہے۔ جانوروں کی طرح بے قاعدہ زندگی نہیں گزاری۔ دنیا کی تقریباً سبھی داستانوں میں عشق و محبت کا موضوع مشترکہ ہے۔ ان داستانوں میں اعلیٰ قدروں کے نمونے اور زندگی گزارنے کے رہنما اصول نظر آتے ہیں۔ سلیم آغا قزلباش لکھتے ہیں:

> ”دنیا کے مختلف ملکوں کی داستانوں میں جغرافیائی ماحول اور تمدنی فضا کی تبدیلی کے باوجود واقعات اور کرداروں کے عمل اور رد عمل میں مماثلت ملتی ہے۔ مثلاً داستانوں کے ذریعے عشق و محبت کی واردات

> کا بیان، ہرن کا پیچھا کرتے ہوئے شہزادے کا راستہ بھول جانا، کسی مرد دانا کا اس کی رہبری کرنا، کسی پری پر شہزادے کا یا شہزادے پر پری کا عاشق ہو جانا، جون کا بدل جانا وغیرہ۔ یہ سب کچھ اس پہلو کو ظاہر کرتا ہے کہ مختلف داستانوں کا بنیادی ”ساختیہ“ ایک ہے، فرق بنت کاری یعنی کہانی کی امکانی صورتوں کی بوقلمونی کا ہے۔“[2]

ہندوستان میں داستان کے باقاعدہ آغاز و ارتقا سے قبل قصہ گوئی کی توانا روایت موجود تھی۔ داستانیں اسی قصہ گوئی کی توسیع ہیں۔ مہابھارت، بیتال پچیسی، پنچ تنتر میں قصہ در قصہ کی روایت ملتی ہے۔ ہندوستان میں داستان کو فروغ تب حاصل ہوا جب وہ سیاسی طور پر انحطاط کا شکار تھا۔ اس تلخ حقیقت سے چشم پوشی کے لیے خیالی دنیا میں پناہ لی گئی۔ داستان کا ہیرو بھی کئی مصائب کا سامنا کر کے بالآخر کامیاب و کامران ٹھہرتا ہے۔ یہاں کے لکھاریوں نے تخیل اور رومان سے ایسی فضا تخلیق کی کہ لوگ وقتی طور پر تمام پریشانیون کو بھول کر داستان کے حسن و سحر میں گرفتار ہو گئے۔ ذہن کے نہاں خانے میں یہ حسرت ضرور ہوتی تھی کہ داستان کے اختتام کی طرح بالآخر ملکی حالات بھی خوش گوار ہو جائیں گے۔ امن و امان اور خوش حالی کیا دور آئے گا۔

داستانوں میں زیادہ تر طبقہ اشرافیہ اور ان کا رہن سہن دکھایا گیا ہے۔ ان لوگوں کے طرزِ زندگی سے ہم اس دور کی تہذیبی زندگی کی بازیافت کرتے ہیں۔ قریب قریب انسانی زندگی کے بیش تر پہلو داستان میں بیان کیے گئے ہیں۔ زیادہ داستانیں فورٹ ولیم کالج کے پلیٹ فارم سے لکھی گئیں۔ کالج کے قیام کا مقصد سیاسی تھا لیکن اس دور کے مصنفین نے تہذیب اور معاشرتی زندگی ان داستانوں میں سمو دی۔ داستانوں میں مافوق الفطری عناصر کی موجودگی پر اعتراض کیا جاتا ہے لیکن قدیم ہندی روایت کے مطابق کبھی اس زمین پر انسان اور دیوتا اکٹھے رہتے رہے ہیں جو مصائب میں اور شر کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرتے رہے۔ داستانوں میں انسانی ہمدردی، مدد کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کا اخلاقی رخ دیکھیں تو پند و نصائح کے عمدہ نمونے داستانوں میں موجود ہیں۔ ان داستانوں میں ہند اسلامی تہذیب کے عناصر پوری آب و تاب سے نظر آتے ہیں۔ رواداری، خدا پر یقین، مذہبی عقائد کا احترام، ہندوؤں مسلمانوں کے مشترکہ رسوم، مجلسی زندگی، رقص کی محفلیں، دستر خوان پر انواع و اقسام کے کھانے ان داستانوں میں جابجا نظر آتے ہیں۔ ان داستانوں کے کردار بہادر ہیں۔ یہ دکھانا مقصود تھا کہ بدی پر آخر نیکی غالب آتی ہے۔ حضرت نظام الدین اولیا کا جی بہلانے کے لیے انھیں باغ و بہار سنائی گئی جس کا مقصد طبیعت کو فرحت بخشنا اور اعلیٰ تعلیمات کا عکس پیش کرنا تھا۔

ان داستانوں میں اس دور کے جلسے جلوس، تہوار، رہن سہن کے طور طریقے، شادی بیاہ کی رسومات دکھائی گئی ہیں۔ زیورات کی اقسام کا پتہ چلتا ہے۔ ان داستانوں کا مطالعہ در اصل ہند اسلامی تہذیب اور مشرقی روایات کا مطالعہ ہے جو اس وقت پوری آب و تاب سے موجود تھی جس کے پورے عالم میں چرچے تھے۔ آج بھی جس کی شان و شوکت پر فخر کیا جاتا ہے۔ دربار سے خانقاہ اور خانقاہ سے بازار، تجارت، مغلیہ عہد کی شان و شکوکت، لکھنؤ کی تہذیب جو دلی کی تہذیب کی ہی شکل ہے اور معاشرت کی بہت سی باتیں ان داستانوں میں محفوظ ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

> ”ہماری داستانوں میں عظمت رفتہ کے بعض شعبوں کے تاب دار مرقعے پائے جاتے ہیں۔ اس میں انیسویں صدی کے لکھنؤ کی تہذیب کا شکوہ محفوظ ہے۔ باغ و بہار، فسانہ عجائب، سروش سخن، طلسم حیرت اور داستان امیر حمزہ کی دکان میں اس نوع کا قابل قدر سرمایہ ہے۔ چار درویش کا مصنف مغلیہ سلطنت کی بزم آخر دیکھ چکا تھا۔ اس نے باغ و بہار میں شوکتِ مغل کی آئینہ داری کی۔ لباس، طعام، خدام، فرش فروش، سامان آرائش وغیرہ کی ایک طویل فہرست پیش کی۔ شہزادی بصرہ کے ملک کی مہمان داریاں ملاحظہ کیجیے۔ بصرے کے نام سے دلی کی تہذیب کاغذ پر اتار کر رکھ دی ہے۔ گل بکاؤلی میں ضیافت اور شادی کے موقع پر اسلامی شرفا کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ فسانہ عجائب کا دیباچہ ایک گزری تہذیب کی اجمالی تاریخ ہے۔ اس کے علاوہ جان عالم کی شادی کے موقع پر جو شان دار تفصیلیں ہیں وہ فرماں روایانِ اودھ ہی کے شایانِ شان ہیں۔ شادی کی رسوم، سازو سامان، سواری کے بینات یوں تو داستانوں کے عام موضوع ہیں لیکن جزئیات کا جو انبار فسانہ عجائب میں ہے وہ شاید دوسری جگہ نہ ہو۔“[3]

رجب علی بیگ سرور نے ہند اسلامی تہذیب کے زیر اثر پروان چڑھنے والی رسوم و رواج کو فسانہ عجائب میں محفوظ کر دیا ہے۔ ہندوستانی تہذیب میں خاندانی نظام مضبوط تھا۔ پیدائش، شادی بیاہ، منگنی کی رسومات دھام دام سے منائی جاتی تھیں۔ لڑکیاں والدین کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتی۔ شادی کی نیک ساعت

نجومی اور پنڈت دیکھتے اور دن مقرر کرتے۔ مہندی، بارات ان موقعوں پر پہنا جانے والا لباس، جلوس، سواریاں، بارات کا استقبال کیسے کیا جاتا ہے، ان سب کا احوال فسانہ عجائب میں سمو دیا گیا ہے۔ خاص طور پر لکھنوی تہذیب کی دل کشی پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہے۔ برات کی شان و شوکت کی تفصیل دیکھیے:

> ”غرض نوشہ سوار ہوا، شور وغل یک بار ہوا۔ کسی نے کہا سوار، سوار جلدی لانا! کوئی پٹکا، شملہ سنبھال خدمت گار کو پکارا کہ ہاتھی بٹھان! پلٹنیں، عربی باجے بجنے لگے۔ کوس و کور گرجنے لگے۔ نوبت و نشان، ماہی مراتب، جلوس کا سامان۔ سواروں کے رسالے دو رویہ باگیں سنبھالے۔۔۔۔ ہزاروں غلام زریں کمر، سنہری رپہلی انگیٹھیاں ہاتھوں میں، جھولی میں عبر سارا، عود غرقی بھرا، سارا شہر مہکتا۔ گرد ہزار ہا دھج شاخہ پھنکتا، سونے چاندی کی دستیاں روشن۔۔۔۔ دولھا زنانے میں طلب ہوا۔ وہاں رسمیں ہونے لگیں۔ وہ بھی عجب وقت تھا: آرسی مصحف رو بہ رو، محبوب دل خواہ و بہ دو، سورۃ اخلاص کھلا، آئینہ رونمائی میں مزے لوٹتا، سلسلہ محبت مستحکم ہورا۔ ڈومنیوں کا سیٹھنیاں گانا، دولھا دلھن کا شرمانا۔ کبھی ٹونے، گاہ اچھے بنے سلونے۔ ہم جولیوں کا پوچھنا: ٹنا لگانا؟ دولھا کا ہنس کے کہنا: عرصہ ہوا۔ کوئی دلھن کی جوتی، دولھا کے شانے میں چھوا گئی۔ کوئی اس کا جل یارا ہوا لگا گئی۔“[4]

نہال چند لاہوری کی داستان ”مذہب عشق“ ہندوستانی تہذیب کی عکاسی کرتی ہے۔ تاج الملوک اور گل بکاؤلی کی شادی پرستان میں ہوتی ہے لیکن شادی کی رسومات ہندوستانی ہیں اور دلی کے شاہی گھرانے کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ برات کا انتظام دیکھا:

> ”اس کے بعد شبھ گھڑی نیک ساعت دیکھ پر شہزادے کو ایک جڑاؤ چوکی پر بٹھلا کر شہانہ جوڑا پہنایا اور شملہ سر پر رکھ کر پیچھے گوشوارہ، آگے موتیوں کا سہرا، اور اس پر پھولوں کا سہرا باندھا۔ جیغہ کلغی سرپیچ لگا، طرہ رکھا، گلے میں موتیوں کا مالا، پھولوں کی بدھی پہنائی، مرصع کے نورتن بازوؤں پر باندھے۔ پھر ایک پری پیکر گھوڑے کے گنگا جمنی ساز لگا کر موتیوں کا سہرا باندھا کر سوار کر دیا۔ اس کے بعد مظفر شاہ کئی بادشاہوں سمیت شہزادے کو بیچ میں لیے۔ امیر اور سردار داہنے بائیں، سواروں اور ہاتھیوں کے پرے آگے۔ زنانی سواری پیچھے، تخت رواں۔ شتر سوار، تلنگوں کی کمپنیاں، پیادون کی پلٹنیں باجے بجاتی ہوئی، خاص بردار، برچھی بردار، بان برداروں کے غول، سوارون کے پرے، آتش بازی چھٹتی ہوئی اور آرائش لٹتی ہوئی۔ اس طرح بیاہنے چڑھا۔“[5]

سید انشا نے ”رانی کیتکی کی کہانی“ میں تخیل اور مشاہدے کی وقت سے جس تہذیب کو پیش کیا وہ ہند اسلامی تہذیب ہے۔ اس داستان کی شاعری، میلے ٹھیلے رسوم و رواج ہندوستانی ہین۔ شادی بیاہ کے موقع پر برات جب دلہن کو لے کر واپس دلہا کے گھر آتی ہے تو کئی رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔ بکرے کی قربانی دینا، دروازے پر تیل چھڑکنا اور گل پاشی کرنے کا بھی رواج ہے۔ دلہا کے عزیز و اقارب دلہن کا چہرہ دیکھ کر تحفے تحائف پیش کرتے ہیں۔ منہ دکھائی / رسم رونمائی پر دیے گئے تحائف دلہن کی نظر میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ دلہا اپنی حیثیت بساط کے مطابق قیمتی تحفہ دیتا ہے۔ راجہ اندر کیتکی کو منہ دکھائی میں بیش قیمت تحائف عطا کرتا ہے۔ منہ دکھائی کی رسم کا ایک منظر دیکھیے:

> ”راجا اندر نے دولھن کو مونھ دکھائی میں ہیرے کا اکڈال چھپر کٹ اور ایک پیڑھی پکھراج کی دی، اور ایک پارجات کا پودھا، جس سے جو پھل مانگیے سو ہی ملے، دولھن کے سامھنے لگا دیا، اور ایک کا دھین گائے کی پٹھیا بھی اوس کے نیچے باندھ دی، اور اکیس لونڈیاں اوھنیں اڑن کھٹولے والیوں سے چن کے اچھی سے اچھی، ستھری سے ستھری گاتی بجاتیاں، سیتی پروتیاں، سگھڑ سے سگھر سونپیں۔“[6]

ہندوستانی مصوری کی روایت ہزاروں سال پرانی ہے۔ اجنتا کے غاروں پر قدیم مصوری کے نمونے موجود ہیں۔ مندروں اور محلات میں مصور اپنے ہنر کے نمونے دکھاتے۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد بھی اس فن نے ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے عروج حاصل کیا۔ مغلیہ عہد حکومت میں فن مصوری پر خصوصی توجہ دی گئی۔

جہاں گیر اس فن میں خصوصی مہارت رکھتا تھا۔ مختلف سلاطین اور امرا اپنی تصویر بنواتے تھے۔ تصاویر بنوا کر گھروں میں آویزاں کی جاتیں۔ ”آرائش محفل“ میں مصوری کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ منیر شامی حسن بانو کی تصویر دیکھ کر ہی عاشق ہو گیا تھا۔ مصوری کے فن کا اظہار ملاحظہ کیجیے:

> ”ایک دن اس کو بلوایا اور کہا، ”اے مصور! مری تصویر بے دیکھے کھینچ۔“
>
> اس نے فرمایا، ”ایک طشت پانی سے بھر کر جلد دیوار کے تلے رکھ دو۔“
>
> نوکروں نے وہی کیا۔ تب وہ اوپر گئی اور پرچھائیں اس کی اس پر پڑی۔ مصور نے ایک نظر پانی میں اس کی شبیہ دیکھ لی اور اپنے گھر آکر دو تصویریں کھینچیں۔ جو تصویر کہ تصویر تھی سو تو اپنے پاس رکھی اور ایسی ویسی حسن بانو کے حوالے کر دی۔ اس نے اس کو بھی پسند کر کے لے لیا اور انعام دے کر رخصت کیا۔“[7]

آرائش محفل میں ہمیں اعلیٰ اخلاقی قدریں عمدہ تہذیب ملتی ہے۔ حاتم کے کردار کے ذریعے ایثار اور خدمت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ گناہ سے توبہ، بدی پر نیکی کی فتح، دوسروں کی مدد کرنا اور صالح معاشرہ اس داستان میں نظر آتا ہے۔ کردار اور واقعات کہیں کے بھی ہوں قصہ کی زمین ہندوستانی ہے۔

اردو داستانوں میں باغ و بہار کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ دو سو سال گزرنے کے بعد بھی یہ دل چسپی سے پڑھی جاتی ہے۔ اس کی زبان فصیح و سلیس ہے اور انداز بیان دلکش ہے۔ میر امن کی داستان کی خصوصیت ہے کہ اس کو جہاں سے بھی پڑھیں روانی، سلاست اور فصاحت ملے گی۔ میر امن نے باغ و بہار میں مشترکہ ہندوستانی تہذیب و معاشرت کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔

ہندوستانی تہذیب میں خاندانی نظام بہت مضبوط تھا۔ عزیز و اقارب کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ باغ و بہار میں بہن بھائی کے پیار کے جھلک دکھایی دیتی ہے۔ ایک بہن کے بھائی کے متعلق کیا احساسات ہوتے ہیں، سسرال میں رہتے ہوئے بھی بیٹی کا خیال مائیکے کی طرف رہتا ہے۔ اس داستان میں ہندوستانی عورت کا بڑا توانا کردار دکھایا گیا ہے۔ ایک بہن جو اپنے بھائی کی بے مروتی اور عدم توجہی کے باوجود جب وہ خالی ہاتھ بہن کے دروازے پر جاتا ہے تو اس پر صدقے واری جاتی ہے، خاطر مدارت کرتی ہے:

> ”وہ ماں جائی میرا یہ حال دیکھ کر بلائیں لی اور گلے مل کر بہت روئی۔ تیل، ماش اور کالے ٹکے، مجھ پر سے صدقے کیے۔“[8]

پہلا درویش کچھ عرصہ بہن کے گھر قیام کرتا ہے مشرقی روایات کے خلاف ہے۔ اس کی بہن اسے سمجھاتی ہے کہ بہن کے گھر رہنا اچھا نہیں اور مردوں کو زیب نہیں دیتا کہ وہ گھر بیٹھے رہیں اور کام کاج نہ کریں۔ وہ بھائی کو ساز و سامان دے کر رخصت کرتی ہے۔ دہی کا ٹیکا لگانا اور امام ضامن باندھنا اس دور کی تہذیبی روایت ہیں اور امام ضامن باندھنے کا رواج آج بھی کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ ہم نے آپ کو خدا کے سپرد کیا۔ رخصت کا یہ منظر دل کش ہے جسے پڑھ کر آنکھیں پُر نم ہو جاتی ہیں۔

> ”جب رخصت ہونے لگا بہن نے ایک سری پاؤ بھاری اور ایک گھوڑا، جڑاؤ ساز سے تواضع کی اور مٹھائی پکوان، ایک خاص دان میں بھر کر ہرنے سے لٹکا دیا، اور چھاگل پانی کی شکار بند میں بندھوا دی۔ امام ضامن کا روپیہ میرے بازو پر باندھا، دھی کا ٹیکا ماتھے پر لگا کر آنسو پی کر بولی ”سدھارو! تمھیں خدا کو سونپا، پیٹھ دکھائے جاتے ہو، اسی طرح جلد اپنا منہ دکھائیو۔“[9]

پہلا درویش جب سوداگر کے گھر ضیافت کھا کے آتا ہے تو شہزادی درویش کو کہتی ہے کہ دوچند ضیافت کرو اور بدلہ اتارو۔ دعوتیں کھانا کھلانا ہندوستان کی تہذیبی روایات میں شامل ہے۔ دعوت کے لیے شہزادی جو انتظام و انصرام اور آرائش و زیبائش کا اہتمام کرتی ہے وہ قابلِ دید ہے۔ یہ آراستگی، قرینے سے رکھا ہو ساز و سامان اسی معاشرت کا نمونہ ہے جو قلعہ معلی اور امرا کی حویلیوں میں رائج رہی۔ یوسف سوداگر کو دی جانے والی ضیافت کا اہتمام دیکھیے:

> ”دیکھا تو تمام حویلی فرش مکلف، لائق ہر مکان کے، جابجا بچھا ہے اور مسندیں لگی ہیں۔ پان دان، گلاب پوش، عطر دان، پیک دان، چنگیرین قرینے سے دھرے ہیں۔ طاقوں پر رنگترے، کنولے، نارنگیاں اور گلابیاں، رنگ برنگ کی چنی ہیں، ایک طرف رنگ آمیز ابرک کی ٹٹیوں میں چراغاں کی بہار ہے۔ ایک طرف جھاڑ اور سرو، کنول کے روشیں ہیں اور تمام دالان اور شہ نشینوں میں طلائی شمع دانون پر کافوری شمعیں چڑھی ہیں اور

> جڑاؤ فانوسیں اوپر دھری ہیں۔ سب آدمی اپنے اپنے عہدوں پر مستعد ہیں۔ باورچی خانے میں دیگیں ٹنٹھنا رہی ہیں۔ آبدار خانے کی ویسی ہی تیاری ہے کوری کوری ٹھلیان، روپے کی گھڑونچیوں پر، صافتوں سے بندھیں اور بجروں سے ڈھکی رکھی ہیں۔ آگے چوکی پر ڈونگے، کٹورے، بمع تھالی، سرپوش دھرے، برف کے آب خورے لگ رہے ہیں اور شورے کی صراحیاں ہل رہی ہیں۔“[10]

ہندوستان میں پھولوں اور باغات کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ ہندوؤں کی مذہبی رسومات میں بھی پھول جزو لاینفک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مسلمان اور ہندو عورتیں بلا تخصیص پھولوں کے گہنے پہنتی ہیں۔ اس خطے میں باغات کی خاص اہمیت رہی ہے۔ مغلوں نے فن تعمیر کو عروج بخشا اور باغات کی تعمیر نے نیا رنگ اختیار کیا۔ باغات میں مصنوعی نہریں، آبشاریں اور فوارے بنائے گئے۔ اکثر عمارات میں باغات لازمی حصہ رہے۔ میر امن نے باغ و بہار میں بھی اس فن تعمیر کو زیب قرطاس کیا ہے۔ قمقمے، فانوس، سرو کے درخت، سرخ پھولوں کا نظارہ کرنا ہو تو پہلے درویش کی کہانی میں جب شہزادی باغ میں پہنچتی ہے تو منظر دیکھیے:

> ”دیکھا تو ٹھیک اس باغ کی بہار، بہشت کی برابری کر رہی ہے۔ قطرے مینہ کے، درختوں کے سرسبز پتوں پر، جو پڑتے ہیں، گویا زمرد کی پڑیوں پر موتی جڑے ہیں، اور سرخی پھولوں کی، اس ابر میں ایسی چھبی لگتی ہے جیسے شام کو شفق پھولے ہے اور نہریں لبالب، مانند فرش آئینے کے، نظر آتی ہیں اور موجیں لہراتی ہیں۔“[11]

ہندوستانی تہذیب میں رقص کو اہمیت حاصل رہی ہے۔ رقص مذہبی رسوم کا حصہ رہا ہے۔ ضیافتوں اور اہم تہواروں کے موقعوں پر رقص کی محافل منعقد کی جاتیں۔ باغ و بہار میں رقص و سرود کی محفلیں جابجا نظر آتی ہیں۔ رقاصائیں اور نو عمر لڑکے اپنے فن سے دیکھنے والوں کو مسحور کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر عفت زریں باغ و بہار میں رقص کی محفل پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

> ”محفل میں رقص کرنے کے لیے صرف طوائفیں نہیں آتی بلکہ نو عمر لڑکے بھی جن کو امرد کہا جاتا ہے محفل ہائے نشاط کی زینت بنتے تھے اور اپنے ناچ رنگ کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اہل محفل ضیافت میں شریک ہونے سے پہلے لباس فاخرہ زیب تن کرتے تھے اور پُر تکلف کے بعد نشہ، شراب یعنی ساغر و مینا کا دور چلتا تھا۔“[12]

باغ و بہار کا تہذیبی مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اس داستان میں عمارات کی آراستگی و پیراستگی، باغات کا دل فریب حسن، ضیافتوں کا ذکر، دستر خوان کے لوازمات، درباروں کی شان و شوکت مغلیہ عہد کی یاد دلاتی ہے۔ اس داستان میں ہند اسلامی تہذیب کے عناصر کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ علی عباس حسینی کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

> ”دہلوی داستان گو اپنی داستانیں دہلی کے دربار کے ماحول سے سجاتا ہے اور اسی معاشرت کا نمونہ پیش کرتا ہے جو قلعہ معلی میں رائج تھی۔ لکھنؤ کا داستان گو جب سماں کھینچتا ہے تو ہم نوابین اودھ کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ دونوں کے ہاں وہی آداب شاہی ہوتا ہے، وہی طمطراق، وہی شان و شکوہ، وہی آن بان، وہی سیر و تفریح، وہی عیش و عشرت، وہی تملق و سخن طرازی، جو اس وقت کے درباروں کی خصوصیت تھی۔ وہ جزئیات کے بیان میں بڑی فراخ دلی سے کام لیتا ہے۔ بات میں بات اور قصے میں قصہ پیدا کرتا ہے۔“[13]

طلسم ہوش ربا میں ہند اسلامی تہذیب کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔ عوام اور خواص کی تہذیبی زندگی، ان کا رہن سہن اور پیشوں کا تفصیل سے ذکر ملتا ہے۔ یہ لکھنؤ کے تمدن کا جامع مظہر ہے۔ داستان میں موجود ساحر اور کئی کرداروں کے نام عرب کے ہیں لیکن ان کی وضع قطع اور داستان کی فضا ہندوستان کی ہے۔ اس داستان میں ہمیں لکھنؤ کے تمدن کی جامع اور ہمہ گیر تصویر ملتی ہے۔ درباروں کی شان و شوکت، لشکر، بادشاہوں کے شاندار جلوس، ہندوستانی میلوں کی رونق کی تمام تر تفصیلات ملتی ہیں۔ چاہ زمرد کے میلے کا منظر دیکھیے:

> ”ہندنیاں اپنا پان ناؤ کیے پھر رہی ہیں۔ ان میں رام جنیاں بھی ہیں کہیں طوائفین بناؤ سنگھار کیے آشناؤں کو ساتھ لیے بیٹھی ہیں۔ کلیجی کے کباب بن رہے ہیں۔۔۔ نٹ تماشا کر رہے ہیں، نٹنیاں ناچ رہی ہیں، جھولے پڑے ہیں، ساون ہوتے ہیں۔ درختون کے نیچے دریاں بچھی ہیں، شریف لوگ بیٹھے ہیں، ایک سمت افیونی بیٹھے ہیں، افیون گھلتی ہے، گنے چھلتے ہیں، حقے توے بھرے رکھے ہیں۔۔۔ تالاب میں جابجا لوگ نہاتے ہیں۔ ہندو

> چندن رگڑ رہے ہیں، تلک دیتے ہیں۔ کھور صندل کے اور قشقے ہاتھوں پر کھینچ رہے ہیں کہیں درخت تلے لٹکن پر گھڑا رکھا ہے۔ پینڈے میں اس کے کہیں سوراخ کیا ہے۔ نیچے سری مہادیو جی کی مورت رکھی ہے۔ اس پر بوند بوند پانی ٹپکتا ہے۔ بعض اوراج کا مالا ہاتھ میں لیے رام نام جپ رہے ہیں۔ بعض اکڑ بل کر کے چکر لے رہے ہیں۔ بعض کمل کی تھیلی گلے میں ڈالے مالا جپتے ہیں، بعض گائے کی مورت ہاتھ میں لیے چندرماں کو پانی دیتے ہیں۔ پیپل کے درخت پر کھاروے کی جنڈی بندھی ہے، چبوترہ درخت کا بندھا ہے۔“[14]

یہ میلہ ہندوستانی میلہ ہے۔ ہندوستان میں ہر شہر، دیہات میں ایسے میلے ہوتے تھے۔ لکھنؤ میں میلوں کی بنیاد واجد علی نے ڈالی اور یہاں کے میلوں کی شائستگی و دلفریبی ہندوستان بھر میں مشہور رہی ہے۔ لکھنؤ کے مشہور میلوں میں علی گنج کا میلہ، آٹھوں کا میلہ، مہتروں کا میلہ، عید کے پیچھے ٹر اور ہولی کا میلہ شامل ہیں۔ درج بالا اقتباس میں مصنفین نے اپنی آنکھوں دیکھا حال قلم بند کیا ہے۔ تخیل کی بجائے خارجی حقیقت سے کام لیا ہے۔ اور لکھنؤ کی تہذیب کی مرقع کشی کی ہے۔ محمد حسن عسکری کی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ ” اگر شرر لکھنؤ کے متعلق اپنی کتاب نہ لکھتے تب بھی ’طلسم ہوش ربا‘ کی مدد سے پرانے لکھنؤ اور وہاں کی معاشرت کی جیتی جاگتی تصویر مرتب ہو سکتی تھی۔“[15]

لکھنؤ اور دلی کی تہذیب میلے ٹھیلوں، شادہ بیاہ کی رسومات کی تہذیب نہیں بلکہ وہ اپنی زبان و بیان کی چاشنی اور عظیم الشان محاورات کا خزانہ رکھتے ہیں۔ ان داستانوں کی زبان ہمیں تہذیب سے آشنا کراتی ہے۔ اصلی زبان ہو یا روایتی، عوام کی ہو یا خواص کی محفوظ ہو گئی ہے۔ ان داستانوں میں بادشاہ، غلام، کنیزیں، شہزادیاں، تاجر، دکاندار، پریاں، جنات بات چیت کرتے دکھائی دیتے ہیں اور ان کی بات چیت سے تہذیب آشکار ہوتی ہے۔ دلی اور لکھنؤ میں کٹنیوں کی الگ حیثیت تھی۔ ان سے جاسوسی کا کام لیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ جو کام جاسوس نہیں کر سکتے تھے دشمنوں کو نقصان پہنچانے کے لیے وہ کام ان کٹنیوں سے لیے جاتے تھے۔ افرسیاب جب کٹنیوں کو بلاتا ہے تو اپنے ہنر کو جن الفاظ میں بیان کرتی ہیں ان کی چاشنی سے لطف اندوز ہوں:

> ” ہمارے کام کو آپ کیا پوچھتے ہیں؟ ہم نے سینکڑوں گھر غارت کر دیے، لاکھوں کو بہلا کر، پھسلا کر، پیچ ڈالا، ہزاروں نسبتیں اور بیاہ کرا دیے اور صدہا طلاقیں دلا دیں۔ آپس میں دوشیدائے محبت کے جانی دشمنی کرا دی، اور بہت بہو بیٹیاں جن کا دامن تک کسی نے نہ دیکھا تھا ان کو نو نو یار کرا دیے، اور بڑے بڑے اڑیل مہاجنوں کے گھر بھید بتا کر چوروں کو کدایا، جہاں ہوا نہ جا سکتی تھی وہاں کا حال بتایا۔ اب دنیا میں تو کوئی جعل اور فریب ایسا نہ ہو گا جو ہم کو آتا نہ ہو۔ ہم آگ لگا کے پانی کو دوڑتے ہیں۔ دوست رہتے ہیں اور دشمنی کرتے ہیں۔ ہمارے کاٹے کا منتر نہیں، کہیے تو زمین میں سما جائیں، اور دینار پشت ماہی تحت الثریٰ سے چرا لائیں، اور اگر فرمائیے تو فلک چہارم پر اپنے تئیں پہنچائیں اور ورق آفتاب سے سونا اتار لائیں۔ آسمان پھاڑ کر تھگلی لگانا ہمارے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ عرش اعظم ہلنے لگے۔ اس طرح دل ستائیں۔“[16]

اردو داستانوں سے ہم عصر مشترکہ ہندوستانی تہذیب کی بازیافت کی جا سکتی ہے۔ مصنفین کے زمانے کی تہذیب اور قریب قریب انسانی زندگی کا ہر پہلو داستانوں میں مل جاتا ہے۔ یہ داستان گویوں کی شعوری یا ارادی کوشش نہیں محسوس ہوتی بلکہ بالواسطہ طور پر تہذیبی عناصر جگہ پا جاتے ہیں۔ انھوں نے معاشرت کے آداب، اپنے زمانے کے مذہبی تہوار، سامان آرائش و زیبائش، میلے ٹھیلوں کی شان و شوکت اور مختلف پیشوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ دہلی اور لکھنؤ میں اٹھارویں صدی میں استعمال ہونے والے ملبوسات، زیورات کی مختلف اقسام، شادی بیاہ کی رسومات مہمانوں کو پیش کیے جانے والے مشروبات، انواع و اقسام کے طعامات، بادشاہوں کے جلسے جلوس اور بہت سی معلومات داستان کے ذریعے بیان ہوئی ہیں۔ جہاں مہم جوئی، جرأت و بہادری کے قصے بیان ہوئے ہیں وہیں اخلاقی قدروں کی اہمیت بھی بیان کی گئی ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی داستانوں کا مطالعہ مغلیہ عہد اور نوابان اودھ کی تہذیب کا مطالعہ ہے جو ہم عصر تہذیبوں میں الگ شناخت رکھتی ہے۔ تہذیب کا پہلا مرکز گھر ہے، پھر مدرسہ اور بازار، داستانوں میں ان کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے۔ بازاروں میں دکان داروں کی اقسام، مختلف پیشہ ور لوگ اور صنعت و حرفت سے آگاہی ہوتی ہے۔ ہندوستان کے مختلف ممالک سے تجارتی تعلقات رہے ہیں۔ مختلف ممالک سے تجارت ان داستانوں میں دکھائی گئی ہے۔ ان ممالک کی تہذیب سے آشنائی بھی ہوتی ہے لیکن زیادہ تر دوسری تہذیبوں اور معاشرت کے بیان میں ہندوستانی تہذیب کو مد نظر رکھا گیا ہے۔

اردو داستانوں میں الفاظ و محاورات کا خزانہ موجود ہے۔ ایسی تراکیب اور جملے ہیں کہ ان میں گہرے اور وسیع معنی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ داستان نگاروں نے اپنے تصور تخیل اور زبان بیان سے ایک جہان آباد کر دیا ہے۔ کئی کرداروں کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہمارے دیکھے بھالے ہیں اور ان سے کبھی واسطہ ضرور پڑ چکا ہے۔ داستانوں میں عورتوں کے کرداروں کی زبان جان دار ہے جن سے تہذیبی رنگ جھلکتا ہے۔ اطہر پرویز لکھتے ہیں:

> ”لکھنؤ اور دہلی کی تہذیب محض رسم و رواج، شادی بیاہ اور ناچ رنگ سے ہی عبارت نہیں، بلکہ لکھنؤ اور دہلی اپنی زبان اور اس کے بیان میں بھی قدرت رکھتے ہیں۔ یہ داستانیں زبان کے اعتبار سے ایک مخصوص تہذیب رکھتی ہیں۔ ہم ان کو پڑھ کر اپنے آپ کو ان تہذیبوں سے اور زیادہ قریب پاتے ہیں۔ فسانہ عجائب، طلسم ہوش ربا، طلسم حیرت میں زبان و بیان نے ایک سماں پیدا کر دیا ہے۔ خاص طور پر عورتوں کی بولی تو جس نفاست کے ساتھ ان داستانوں میں استعمال ہوئی ہے اور کہیں نہیں۔ اور اس میں ہر طبقے کی زبان سننے میں آتی ہے۔ اس میں لکھنؤ اور دہلی کے محاورے چاشنی دیتے ہیں۔ ان میں بیگمات، مغلانیاں، انائیں، کنیزیں، محل دارنیاں، خواصیں، غرض محلات کے اندر رہنے والی پر عمر کی عورتیں بات کرتی نظر آتی ہیں۔“[17]

اردو داستانوں میں ہند اسلامی تہذیب کے عناصر جابجا نظر آتے ہیں۔ ان کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ تہذیب کے بے شمار پہلو ہیں کیوں کہ تہذیب کا دائرہ وسیع ہے۔ تمام پہلوؤں کا احاطہ ممکن نہیں۔

[1] ۔ وقار عظیم، سید، داستان سے افسانے تک، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، 2016ء، ص۔ 8

[2] ۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، جدید افسانے کے رجحانات، کراچی، انجمن ترقی اردو، پاکستان، 2000ء، ص ص۔ 61-62

[3] ۔ گیان چند جین، ڈاکٹر، اردو کی نثری داستانیں، لکھنؤ، اترپردیش اردو اکیڈمی، 1987ء، ص۔ 83

[4] ۔ رجب علی بیگ سرور، مرزا، فسانہ عجائب، لاہور، مجلس ترقی ادب، مدون رشید حسن خاں، 2008ء، ص ص۔ 140-141، 142

[5] ۔ نہال چند لاہوری، مذہب عشق (قصہ گل بکاؤلی)، لاہور، مجلس ترقی ادب، 2008ء، ص۔ 117

[6] ۔ انشااللہ خاں انشا، رانی کیتکی کی کہانی، مشمولہ انشان کی دو کہانیاں، مرتب انتظار حسین، لاہور، مجلس ترقی ادب، 2008، ص۔ 80

[7] ۔ حیدر بخش حیدری، آرائش محفل (قصہ حاتم طائی)، لاہور، دارالنوادر، 2006ء، ص۔ 33

[8] ۔ میر امن، باغ و بہار، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 2000ء، ص۔ 20

[9] ۔ ایضاً، ص۔ 21

[10] ۔ ایضاً، ص۔ 27

[11] ۔ ایضاً، ص۔ 38

[12] ۔ عفت زریں، ڈاکٹر، فورٹ ولیم کالج کی نثر ی داستانیں (ایک تہذیبی مطالعہ)، دہلی، مرکزی۔۔۔، 1992ء، ص۔ 172

[13] ۔ علی عباس حسینی، اردو ناول کی تاریخ اور تنقید، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1987ء، ص۔ 149

[14] ۔ محمد حسین جاہ، احمد حسین قمر، طلسم ہوش ربا، انتخاب محمد حسن عسکری، لاہور، نگارشات پبلیشرز، 2014ء، ص۔ 102، 103

[15] ۔ ایضاً، دیباچہ، ص۔ 22

[16] ۔ ایضاً، ص۔ 86، 87

[17] ۔ اطہر پروز، داستان کا فن، علی گڑھ، اردو گھر، 2010ء، ص۔ 129